معیار: علمی و تحقیقی مجلّہ، شعبۂ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، جلد:۱، شمارہ:۱، جنوری-جون ۲۰۰۹ء

'وزیر بیگم': کردار نگاری کی ایک مثالی جہت

شگفتہ حسین *

مشل فوکو سے اُردو ادب کا تعارف اس وقت ہوا جب ساختیات، پسِ ساختیات اور ردِ تشکیل کا شہرہ ہوا۔ فوکو اس بات کا قائل ہے کہ متنیت ہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ دُنیا میں طاقت کے کھیل میں بجائے متن کے ڈسکورس شامل ہے۔ لفظ ڈسکورس فوکو کی تھیوری میں ایک واضح نظام کے طور پر موجود نہیں ہے تاہم یہ اس کے کام کا نہایت اہم جز ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق ڈسکورس کے بارے میں سوچنے کا ایک بہترین طریقہ یہ ہے کہ ڈسکورس علامتوں کا ایک گروہ نہیں بلکہ Practices کا نام ہے جنھیں ایک خاص نظام کے ذریعے کسی شے میں ڈھال دیا گیا ہو۔[۱] جب ہم ڈسکورس کی بات کرتے ہیں تو ایک طرح سے ہم ڈسکورس سے پیدا ہونے والے اثرات کی بات کر رہے ہوتے ہیں۔ اس میں کئی قسم کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً سچ کا اثر، طاقت کا اثر اور علم کا اثر وغیرہ وغیرہ۔ سچ سے فوکو کی مراد وہ نظریاتی اور خیالی خصوصیت نہیں ہے جس کا انسان صدیوں سے متلاشی ہے۔ فوکو کے نزدیک یہ سچ دنیاوی سچ سے ہٹ کر ہے۔ فوکو یہ سمجھتا ہے کہ ہر علاقے میں اپنا علاقائی سچ ہوتا ہے اور ہر علاقے میں سچ کی ایک عام سیاست ہوتی ہے اور اس علاقے کا ڈسکورس اسی سچ کے نظام کو بیان کرتا ہے۔ چنانچہ ایک معاشرے کا سچ وہ ہے جسے معاشرہ قبول کرتا ہے۔[۲]

فوکو کے ہاں ڈسکورس میں طاقت ایک بہت اہم عنصر ہے۔ طاقت سے مراد کسی چیز پر قبضہ نہیں کسی کا حق چھیننا نہیں یا جیسے مارکسسٹوں کے نزدیک طاقت کے تعلقات معاشی تعلقات سے متعین ہوتے ہیں ایسا بھی نہیں بلکہ فوکو کے نزدیک طاقت سے مراد کسی کو اپنی خواہش کے مطابق سوچنے سے روکنا یا کسی کی آزادی کو محدود کرنا ہے۔[۳] سچ یہ ہے کہ طاقت اور طاقت کا استعمال انسان کے تمام رشتوں اور تمام رویوں میں موجود ہے۔

فوکو ڈسکورس سے مراد خیالات، رویے، موقف سبھی کچھ لیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جو ڈسکورس کی طاقت رکھتے ہیں وہ ان کو جو ڈسکورس کی طاقت نہ رکھتے ہوں اپنے حکم پر چلاتے ہیں۔[۴]

ایڈورڈ سعید اپنی کتاب شرق شناسی (Orientalism) میں مشرق پر نوآبادیاتی نظام مسلط کرنے والے سفید فاموں کے بارے میں لکھتا ہے:

> ''سفید فام آدمی کے مصنوعی چہرے کے پیچھے ہمیشہ طاقت استعمال کرنے کے لیے آمادگی موجود ہوتی ہے جس کے بل بوتے پر وہ مرنے مارنے کے لیے تیار رہتا ہے۔۔۔ سفید فام ہونا ایک تصور ایک حقیقت تھا اس حقیقت کا تقاضا یہ تھا کہ سفید اور غیر سفید دنیاؤں کے بارے میں ایک منطقی رویہ اختیار کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ نوآبادیات میں ہوتے ہوئے ایک خاص طریقے سے بات کی جائے، قواعد کے ایک مجموعے کے مطابق طرزِ عمل

* صدر شعبۂ اُردو، ڈگری کالج برائے خواتین، کچہری روڈ، ملتان

اختیار کیا جائے اور کچھ باتوں کے بارے میں محسوس کیا جائے اور کچھ باتوں کے بارے میں ہرگز نہ سوچا جائے۔'' ۵

فوکو اور ایڈورڈ سعید کے نظریات کی روشنی میں اگر شمس الرحمان فاروقی کے ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ نوآبادیاتی نظام کی اسی مافوق الفطرت قوت نے برصغیر پاک و ہند میں طاقت ور ہنداسلامی تہذیب کو عدم توازن کا شکار کرتے ہوئے رفتہ رفتہ ہندیورپی تہذیب میں ڈھالنا شروع کر دیا تھا۔ نظریہ یہ تھا کہ ہندوستان کے لوگ حکومتِ خوداختیاری سے ناواقف ہیں لہٰذا ان کو انہی کے مفاد کی خاطر حالتِ غلامی میں رکھنا بہتر ہوگا۔ احمد محفوظ ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کی تحسین کے ساتھ اس عہد کو بھی سراہتے ہیں کہ یہ ناول ہمیں ایسی دُنیا کی سیر کراتا ہے جو ''معاشرتی اور تہذیبی لحاظ سے بے حد معمور ہے۔ یہاں کی زندگی اور اس کی اقدار نہایت مستحکم اور توانا ہیں۔'' ۶ بلاشبہ یہ دنیا معاشرتی اور تہذیبی لحاظ سے معمور ہے لیکن اس کی اقدار کے استحکام اور توانائی کے دعوے درست نہیں۔ خود شمس الرحمٰن فاروقی یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا ان لوگوں کو ''کچھ اندیشہ یا تصور تھا کہ ان کی تہذیب کی رِدا اس طرح پارہ پارہ ہونے والی ہے کہ ان کا نظامِ اقدار جلتے ہوئے ملک کا گاڑھا دھواں بن کر سمندر میں تحلیل ہو جائے گا۔'' ۷ فوکو کے نظریات کے مطابق ماننا پڑتا ہے کہ برصغیر پر جو طاقت ور تہذیب غالب آ رہی تھی وہ ان کا ڈسکورس طے کر رہی تھی کہ ہندوستان کے لوگوں کو کیا کہنا چاہیے اور کیا نہیں کہنا چاہیے۔ ان کا نظامِ اقدار اب توانا نہیں، رفتہ رفتہ راکھ کا ڈھیر بنتا جا رہا تھا۔ ڈسکورس تھیوری کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ طاقت اپنا مرکز بدلنے کے ساتھ کمزور بھی ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً گنگا جمنی تہذیب ہنداسلامی تہذیب کے آگے جھکی اور ہنداسلامی تہذیب ہندیورپی تہذیب کی طاقت سے متاثر ہوئی، لیکن ماننا پڑتا ہے کہ ہندوستان کو اس مرتبہ اس تہذیب کا سامنا تھا جو گزشتہ تہذیبوں کے مقابلے میں زیادہ طاقتور اور جارحانہ کردار رکھتی تھی۔ اس طاقتور تہذیب سے پہلے ہندوستانی سماج میں شادی بیاہ کا مضبوط ادارہ، سماجی تعلقات کا ادارہ اور مغل ریاستی ادارہ اپنی طاقت سے زبان اور کلچر پر اثر انداز ہوتے رہے تھے لیکن اب ان طاقتور اداروں میں تبدیلی آ رہی تھی۔ شادی بیاہ کے ادارے کی مضبوطی بظاہر تو قائم تھی لیکن اس کی Santity کو رکھیل بھی متاثر کر رہی تھی۔ سماجی تعلقات کے ادارے کا ڈسکورس بھی بدل رہا تھا اور اسی سبب رکھیل بھی نئے معنی پا رہی تھی۔ بے نکاحی بیبیاں مردوں کے لیے تو کبھی بھی باعثِ شرم نہیں رہیں لیکن اس عہد کی خواتین بھی فرنگیوں یا ہندوستانیوں کی ''پابند'' ہونے کو قطعی معیوب یا باعثِ ذلت تصور نہیں کرتی ہیں۔ بہرحال یہ اس عہد کا وہ سچ تھا جسے اس معاشرے نے قبول کر لیا تھا۔

لیکن اس وقت میرے پیشِ نظر نہ تو یہ طاقتور ادارے ہیں اور نہ زبان و کلچر پر ان کا حکم بلکہ وزیر بیگم یعنی چھوٹی بیگم ہے جو نسائی طاقت کا ادارہ بن کر مجھے مل رہی ہے۔ اس کا مردوں سے ڈسکورس اسے ایک مِتھ بنا رہا ہے۔ اس کی زبان، اس کا لباس، چال، سولہ سنگھار اس کا قرینہ، رکھ رکھاؤ، شاعرانہ ذوق اور اس ذوق کا برجستہ اظہار اور سب سے بڑھ کر خود اس کا شاعرہ ہونا، ہر ہر ادا ایسی ہے کہ کیا مارسٹن بلیک اور کیا نواب شمس الدین، کیا ولیم فریزر اور کیا آغا تراب، کیا نواب ضیاالدین اور کیا ہمارے شمس الرحمان فاروقی، ہر کسی کو اس بارگاہ حُسن میں جبینِ نیاز خم کرتے ہی بنتی ہے۔

چھوٹی بیگم کی نانی اکبری بیگم فرخ آباد کی مشہور ڈیرے دارنی تھی۔ منجھلی بیگم اور چھوٹی بیگم دونوں کی تربیت انہی کے ہاتھوں ہوئی۔ نستعلیق گفتگو، بذلہ سنجی، بات بات پر شعر خوانی اور بیگماتی رکھ رکھاؤ کے ساتھ ساتھ گیت سنگیت سے واقفیت، دونوں بہنوں نے یہ فیض نانی کے کوٹھے سے پایا۔ والد بزرگوار تو پہلے ہی یہ کہہ رہے تھے کہ چھوٹی بیگم کے ''بچپن ہی سے اس کے مزاج میں، سبھاؤ میں، بولی میں ایسا ڈومنی پن نکلتا تھا کہ میں اسے دیکھ دیکھ ڈرے تھا کہ بڑی ہو کر کیا غضب ڈھائے گی۔'' ۸ اور پھر یہ بھی کہ نانی کے ہاں، ''اس کی اصل تعلیم ان امور میں ہوئی جن کو سیکھ سمجھ کر عورت ذات مردوں پر راج کرتی ہے۔ سات آٹھ برس کی تھی جب اسے اپنے حُسن اور اس سے بڑھ کر اس حُسن کی قوت اور اس قوت کو برتنے کے لیے اپنی بے نظیر اہلیت کا احساس ہو گیا تھا۔'' ۹ ہر شخص کو حتیٰ کہ اپنے والدین کو بھی انگلیوں پر نچاتی تھی۔ تیرہویں برس میں لگی تو باقاعدہ پیغام آنے لگے اور اچھی جگہوں سے یہ اشارے بھی کہ وہ ''ہماری پابند'' ہو جائے لیکن ''نکاح یا گھر آباد کرنے کے نام پر تو اسے

گویا دوں لگ جاتی۔'' ۱۰؎ بقول اس کے ''تعلق وہی اچھا جس کو توڑ سکوں'' اور یہ بھی ''مجھے جو مرد چاہے گا اسے چکھوں گی پسند آئے گا تو رکھوں گی، نہیں تو نکال باہر کروں گی۔'' ۱۱؎ اسے اپنے طبقے سے مرد چننا پسند نہ تھا۔ اس نے صرف طاقتور مردوں سے وابستہ ہونا پسند کیا۔ پہلا تعلق قائم کیا تو طاقتور فرنگی مارسٹن بلیک سے اور اپنی مرضی سے کیا۔ اسے اُمید تھی کہ وہ ایک دن دہلی میں جرنیل کے عہدے پر ضرور فائز ہوگا کیوں کہ وہ اٹھائیس برس کی عمر میں کپتان بن گیا تھا۔ وہ قتل ہوا تو اس کے سامنے دو مسائل تھے ایک تو تنہائی اور دوسرا آذوقۂ حیات۔ اور ان دونوں کے لیے کسی مرد سے وابستہ ہونا ضروری تھا۔ حیثیت والے، ثروت مند اور طاقتور مرد سے اور وہ بھی اپنی شرطوں پر۔ قرۂ فال نواب شمس الدین احمد کے نام نکلا وہ دار کی زینت بنے تو نواب آغا تراب کی قسمت جاگی، وہ ٹھگوں کے ہاتھوں جہانِ فانی سے رخصت ہوئے تو اب کے شاہی محل چھوٹی بیگم کے حُسن سے منور ہوا۔ کچھ بھی سہی ہر تعلق اس نے اپنی شرائط پر قائم کیا۔

دلّی والے اسے ڈومنی کہتے تھے لیکن اپنے تئیں وہ کسی بیگم سے کم نہ تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں ''ڈومنی پن ایسا چوکھا تھا کہ ہر رنگ میں اور ہر امر سے نکلتا تھا۔'' ۱۲؎ نواب یوسف علی خان سے مل رہی ہے اور اس وقت، ''وہ دوبر کا بنارسی گلبدن کا چٹاپٹی ڈھیلا پاجامہ پہنے ہوئے تھی اوپر سے تنگ لیکن نیچے آتے آتے اس کا گھیر بڑھتا گیا تھا۔۔۔۔ دوبر کا پاجامہ عموماً بدن کے خطوط کو ڈھانکنے کے لیے پہنتے ہیں، لیکن وزیر اپنے بدن کو کچھ اس طرح چُرا کر دو پہلو بیٹھی تھی کہ رانوں کے زاویے کچھ نمایاں ہونے لگے تھے۔ نہایت باریک ریشمی جالی دار ہلکے دودھیا رنگ کے تاش کی انگیا خوب ٹھیک کسی ہوئی تھی۔'' اس کے سر پر دوپٹہ نہ تھا، ''ایک نیلگوں سنہرا بادل تھا جس کے پیچھے سے اس کے ماتھے اور رخسار اور ٹھوڑی کی ملیح جگمگاہٹ کھنچے ہوئے بدن کے نشیب و فراز اس کے گلے کا نولکھا زبرجدی ہار اور گردن کی نیلمی دھکدھکی، کانوں میں یاقوت کی انتیاں، کلائی میں جڑاؤ شیر دہاں چوڑوں کے بیچ میں کریلیاں، کلمے کی انگلی اور چھنگلیا میں ہیرے اور لہسنیا کی جڑاؤ انگوٹھیاں، ناک میں زمرد کی نتھ دکھائی دے رہی تھی۔'' ۱۳؎ یہ نواب یوسف علی خان وہ ہیں جن سے وزیر بیگم کی منجھلی بہن متوسل ہے اور یہ سب سج دھج ان جیسے تجربہ کار حُسن شناس کو بھی سناٹے میں ڈال دیتی ہے اور انہیں بھی اس کی نسائی طاقت ایک جھٹکے سے آشنا کرتی ہے۔ اسی دھج کے ساتھ وہ ولیم فریزر کے ہاں جاتی ہے تو نواب شمس الدین احمد اس کے حُسن کی طاقت کے سامنے ہار مان جاتے ہیں۔ اس کے گھر ملنے کے لیے آتے ہیں تو اس کا قرینہ اس کا سبھاؤ اور پھر اس کے برجستہ اشعار۔

زغارت　چمنت　بر　بہار　منت　ہاست
کہ　گل　بدست　تو　از　شاخ　تازہ　تر　مانند

نواب صاحب کو گھائل ہوتے ہی بنتی ہے کہ اس سے زیادہ کھلی ہوئی دعوت نہ وزیر کی طرف سے ممکن تھی اور نہ نواب کو قبول ہوتی۔

''ہمارے لیے تو آپ رازوں کا ایک پراسرار دریا ہیں وزیر خانم۔ ہم بے سہارا آپ کے دریائے حُسن اور اپنے دریائے شوق میں بہے جاتے ہیں۔''

''عالی جاہ! آپ ہی دریا ہیں آپ ہی ٹاپو۔ بھئی واللہ ہمارے لیے سر ٹکنے کی جگہ تو آپ ہی کے پاس ہے۔'' ۱۴؎

لطف کی بات یہ ہے کہ اسے بے سہارا جان کر مرد حضرات اسے گلے لگانے کو بے قرار ہیں وہ بھی بظاہر ان کی باندی ان کی کنیز، عالی جاہ! کے سامنے دوزانو، آنکھوں میں آنسو، دلنشیں گلوگرفتہ لہجے میں ''سید خواجہ میر صاحب'' کے اشعار پڑھتی، لبوں پر تبسم لیے کچھ ایسی بے ساختہ ادائیں دکھاتی ہے کہ وہ بے چارے بے اختیار اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے اس کی قوتِ بازو بننے کے عہد باندھنے لگتے ہیں۔

''میں تمہاری قوتِ بازو بن سکتا ہوں، جن آنسوؤں نے تمہارا خرمن صبر لوٹا ہے اور سیل بے اماں کی طرح تمہاری ہستی پر چھا گئے ہیں، میں ان کے سامنے بند کی طرح سینہ سپر ہو جاؤں گا۔'' ۱۵؎

بظاہر یونہی کمزور بنی وہ ان مردوں کے دلوں اور جسموں پر راج کرتی رہتی ہے۔ جس کسی کے دامن دل و دامنِ دولت سے وابستہ ہوئی ہے اس سے گفتگو ایسی رجھاتی ہوئی دلنشیں ہوتی ہے گویا وہی پہلا مرد ہے جو اس کی زندگی میں آیا ہے۔ بلا شبہ وہ Seduction Power کی

مالک ہے اور اپنی اس خوبی سے آگاہ بھی ہے۔

> ''ہوش سنبھالنے کی عمر کے آتے ہی وزیر کو اپنے حسن کی ساحرانہ کشش اور اپنی روح میں انگڑائیاں لیتی ہوئی موہنی کا احساس ہو گیا تھا۔ خود پر اعتماد اور پھر مدتوں کی معشوقی نے اس میں ایک دل فریب مگر آسانی سے تسخیر نہ ہو سکنے والا اندازِ تبختر پیدا کر دیا تھا۔ تجربہ زیست نے اسے بھلے برے کی تمیز اور عام چاہنے والوں کے تئیں عام طور پر رعونت کا برتاؤ بھی سکھا دیا تھا۔ اسے اپنی تکمیل کے لیے مرد کی ضرورت نہ تھی۔ مرد کے ذریعے وہ اپنی شخصیت اور وجود کا اثبات چاہتی تھی۔'' ۱۶

زبان طاقت کے تعلقات کو reflect کرتی ہے اور یہ احساس ہمیں ہمیشہ ہوتا ہے، جب جب ہم وزیر بیگم کو مردوں سے ہم کلام ہوتے سنتے ہیں۔ طاقت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے دوسروں کی کمزوریوں کا شعور ہوتا ہے اور وہ اس شعور کی دولت سے بھی مالا مال ہے۔ اس پر طرہ اس کی ذہانت و ذکاوت اور موقعے کی مناسبت سے اظہار جذبات۔

> ''اس نے نواب کا ہاتھ کھینچ کر اپنے سینے پر رکھا اور کہنے لگی، ''اب دیکھئے نہ آپ کی تاخت و تاراج نے میرے دل کا کیا حال کر دیا۔ دھڑکن تیز ہو گئی۔ کہیں غشی نہ ہو جائے۔''
>
> اور پھر
>
> ''اس بار وزیر نے خود کو نواب کے بازوؤں میں آنے دیا اور ان کے شانے پر سر رکھ کر بولی، ''اللہ آپ کی خوشبو ایسی ہے کہ اگلا یوں ہی نشے میں لغزش کھا کر چاروں ہاتھ پیروں سے گرے۔ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں۔'' ۱۷

میرزا فخرو سے پہلی ملاقات ہے اور ابھی وہ ان سے صرف رسمی لگاؤ رکھتی ہے کہ وہ اس کے شوہر ہیں لیکن اندازِ گفتگو ''ہم تو آپ کے طلب گار بن کر یہاں آئے ہیں صاحبِ عالم، ہم تو پہلے ہی آپ کے بندۂ بے دام ہونے کو تیار بیٹھے ہیں پھر نرخ بالا کرنے یا ارزاں کرنے کا کچھ مذکور نہیں ہو سکتا۔'' ۱۸ اور جس کی حوصلہ افزائی نہیں کرنی اس کے لیے شیریں لیکن خیر مقدمی لہجے سے بالکل عاری آواز میں گفتگو ہے۔ نواب ضیاء الدین احمد بلا تکلف ٹھکرا دیئے جاتے ہیں۔

انتظار حسین نے اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے اس امر کا اظہار کیا ہے کہ وزیر خانم کے سامنے ملکہ دوراں نواب زینت محل کا کردار خاک نہیں۔ ''وہ ایک عظیم عورت ہے، اتنی عظیم کہ اس کے سامنے ملکہ ہندوستان نواب زینت محل بھی گھٹ کر ایک معمولی درجے کی جھگڑالو عورت معلوم ہونے لگتی ہے۔'' ۱۹ اب بھلا شمس الرحمٰن فاروقی وزیر خانم کے سامنے نواب زینت محل تو کیا کسی بھی خاتون کا چراغ نہ جلنے دیں تو کون کم بخت چھوٹی بیگم کا مقابلہ کرے۔ یوں بھی بقول چھوٹی بیگم ''میں کل کی گڑیا نہ تھی اپنی مرضی کی عورت تھی۔'' ۲۰ میں نے ابتدا میں اک بات کہی تھی کہ اس کے نسائی ڈسکورس نے ہر مرد کو اس کا مطیع اور طلب گار بنا رکھا ہے حتیٰ کہ شمس الرحمٰن فاروقی بھی اس کی محبت میں گرفتار ہوئے بنا نہیں رہے اور اسی محبت نے انہیں تھوڑا سا نہیں بہت زیادہ جانبدار بنا دیا ہے۔ وہ نواب شمس الدین احمد کی محبوبہ ہے اور نواب صاحب میرزا نوشہ سے کھنچے کھنچے سے ہیں سو فاروقی صاحب بھی غالب سے کھنچے کھنچے سے ہیں ہاں البتہ چھوٹی بیگم کو سید خواجہ میر صاحب سے لگاؤ ہے سو فاروقی صاحب بھی ہر جگہ میر کے اشعار پڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وزیر بیگم کا لختِ جگر نواب میرزا بھی میرزا نوشہ کا نہیں ابراہیم ذوق کا شاگرد بن جاتا ہے حالاں کہ میرزا نوشہ نے اسے گھیرنے کی کوشش تو خوب کی مگر ____ فاروقی صاحب کی اس سے جذباتی وابستگی کا اندازہ اس وقت بھی شدت سے ہوتا ہے جب وہ چھوٹی بیگم کی کنگھی چوٹی کا بیان کرتے ہیں۔ اس کے سبھاؤ، اس کے عشووں غمزوں کا قصہ سناتے ہیں تو ان کی تحریر گنگنانے لگتی ہے، اس کی آنکھوں سے چھلکتے جنس اور شباب کے احساس سے خود ان کی سانسیں بھی رکنے لگتی ہیں۔ چھوٹی بیگم نواب شمس الدین احمد کے ہاں پہلی رات گزارنے جا رہی ہے اور اس دن اس کے لباس کی تراش خراش، اس کے جسم کے خطوط، دائرے اور قوسیں، اس کی

چھب، چال، زیور، جوتی، ایک ایک بات کی تفصیل بیان کرنے کے لیے فاروقی صاحب بلا مبالغہ تین صفحے لے لیتے ہیں۔ وزیر بیگم کا جادو اُن پر ہر اس لمحے سر چڑھ کر بولتا ہے جب وہ کسی مرد کو گھائل کرنے کی تیاری میں ہوتی ہے۔ اس لمحے انہیں خود بھی اس امر کا احساس ہے کہ اس کے نسوانی حُسن کی گہرائیوں کو ماپنے کے لیے ''شیر کا کلیجہ اور تیندوے کی بے حیائی'' ۲۱ درکار ہوتی ہے۔ عالم وصال کا نقشہ بھی اس خوبصورتی سے کھینچتے ہیں کہ سراہے بنا رہا نہیں جاتا۔ چھوٹی بیگم سے ان کی محبت ہی انہیں اس بات پر بھی مجبور کرتی ہے کہ وہ اس کا دفاع بھی کریں لاکھ ابتدا میں انہوں نے اس کے ڈومنی پن کو بیان کیا ہے، لیکن حقیقت میں انہیں اس کا رکھیل ہونا بُرا نہیں لگتا۔ وزیر بیگم کے دل و دماغ کی کشمکش، بچوں کے لیے فکر مند ہونا، نکاح کے بارے میں سوچنا، پھر متشرع مولویوں کی مثالیں دینا کہ وہ بھی تو دو دو غیر منکوحہ بیویاں رکھے بیٹھے ہیں۔ بظاہر یہ وہ تسلیاں ہیں جو وہ وزیر خانم کو دے رہے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے اور اس حقیقت کا اظہار اس وقت ہوتا ہے جب ہم بنی ٹھنی کی معنویت سے آگاہ ہوتے ہیں، کیوں کہ بنی ٹھنی علامت ہے وزیر بیگم کے مردوں سے تعلقات کی۔

چھوٹی بیگم کی داستانِ حیات کے آغاز سے پہلے آپ کو بنی ٹھنی سے متعارف ہونے کا موقع ملتا ہے۔ جس کی بڑی بڑی جامنی آنکھیں، سیدھی ناک ہے، جس میں بڑا سا بلاق اور بلاق میں سرمئی موتی، گردن اونچی نازک نخوت سے بلند ہے، کاسنی رنگ کی کامدار ساری، پلو سے سر ڈھکا ہوا، لیکن ساری اس قدر باریک کہ سر کا ایک ایک بال، مانگ میں چنی ہوئی افشاں کے ذرّے، ماتھے کے جھومر میں جڑے ہوئے یاقوت ہیرے، گومید اور تامڑے صاف جھلکتے ہیں، کھلتا ہوا گندمی رنگ، منہ پر ہلکی سی مسکراہٹ کی شفق ہے۔ یہ بنی ٹھنی، کوئی حقیقی لڑکی نہیں ہے، کشن گڈھ کی شری رادھا ہیں جن کی دودھ جیسی نرم اور شیریں انگلیوں میں نیلگوں مائل سرمئی کنول کی بڑی سی شاداب کلی___ دل کی علامت ہے ۲۲ اور سری کرشن جی کا رنگ بھی نیلگوں یا سانولا ہی فرض کیا جاتا ہے۔ ماضی بعید سے کشن گڈھ کے مصور بنی ٹھنی کے نام سے شری رادھا کی تصویریں ہی بناتے آئے تھے۔ وزیر خانم کے جدامجد میاں مخصوص اللہ بھی کشن گڈھ کے شبیہ ساز ہیں اور جب برف ان کا بستر بنتی ہے تو ان کے بے جان ہاتھ بنی ٹھنی کی شبیہ ہی تھامے ہوتے ہیں۔ ہندو دیو مالا میں وشنو محبت کا دیوتا ہے جس کے دو روپ ہیں ایک رام دوسرا کرشن۔ رام اور سیتا کا عشق میاں بیوی کی محبت کی نمائندگی کرتا ہے لیکن رادھا اور کرشن کا عشق ایک بیاہتا عورت کا دوسرے شادی شدہ مرد سے عشق ہے۔ یہ "Extra Marital Love" ہندو معاشرت میں آئیڈیلائز کیا جاتا ہے، کراہیت کا باعث نہیں بنتا بلکہ تقدیس کا حامل قرار پاتا ہے۔ رادھا کی خیالی شبیہ ہی بنی ٹھنی کہلاتی ہے لیکن اگر آپ ایک لمحے کے لیے ایک طرف رادھا کی شبیہ اور دوسری طرف وزیر خانم کی تصویر رکھیں اور دونوں کو غور سے دیکھیں تو آپ کو ان میں بال برابر فرق دکھائی نہ دے گا بقول سہیل عباس ''ناول کے اختتام پر ایسا لگتا ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی خود مخصوص اللہ ہے اور بنی ٹھنی اصل میں وزیر خانم ہے۔'' ۲۳ دونوں ہی بڑی بڑی جامنی آنکھوں والی ناک میں بڑا سا موتی سجائے، سر پر باریک آنچل ڈالے بیٹھی ہیں۔ رادھا اور کرشن کے جسمانی تعلقات کے حوالے سے چھوٹی بیگم کے مردوں سے تعلقات اور چھوٹی بیگم کے علاوہ بھی کئی دوسری ہندوستانی عورتوں کا انگریزوں، نوابوں، رئیسوں اور مولویوں کی بے نکاحی بیویاں ہونا سمجھ میں آتا ہے گویا یہ وہ سچ ہے جو اس عہد کا سچ ہے جسے اس عہد کا معاشرہ قبول کر چکا ہے۔ نواب شمس الدین احمد خان کے ساتھ پہلی رات گزارنے کے بعد فجر کے وقت وزیر خانم خواب دیکھتی ہے کہ اس کی خواب گاہ ایک مرقع ہے جس میں شاہانہ انداز کی تصویریں ہیں۔ ہر تصویر جگمگا رہی ہے گویا ابھی ابھی تیار ہوئی ہو، لیکن کوئی تصویر نمایاں نہیں کہ ہوا کے جھونکوں سے مرقعے پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ اک ذرا دیر کو ہوا ٹھہری ''تو اس کی نگاہ بھی ٹھہری، یہ تو بنی ٹھنی کی تصویر تھی۔'' ۲۴ نواب صاحب کے وصال سے شاد کام ہونے کے بعد یہ خواب اور بنی ٹھنی کی تصویر گہری معنویت کی حامل ہے۔

فوکو کے ڈسکورس کے مطابق طاقت کا مرکز تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ وہ چھوٹی بیگم جو نسائی طاقت کے بل پر حکومت کرتی ہے، اپنے سے زیادہ مضبوط سماجی اور ریاستی طاقتوں کے سامنے کمزور اور بے بس ہو جاتی ہے یہاں یاسمین حمید سے اتفاق کرنا پڑتا ہے کہ ''اس زمانے میں عورت ہونا کس قدر مشکل اور خوف انگیز رہا ہوگا۔۔۔۔ نہ کوئی تشخص اور نہ کوئی تحفظ اور سلامتی۔'' ۲۵ وزیر بیگم کے بچے چھین لیے جاتے ہیں، وہ اپنی خواہش کے مطابق اسلامی طریقے سے ان کی پرورش نہیں کر سکتی۔ میاں مارا گیا تو اسے سسرال سے نکلنا پڑا اگر بیٹا اس کے ساتھ رہا

تو اس لیے کہ اس کا وعدہ تھا وہ اس کی تربیت سسرال کے مطابق کرے گی۔ پھر یہی بچہ اس کے ساتھ شاہی قلعے میں داخل نہیں ہو سکتا۔ محض اس لیے کہ اس کی توجہ کا مرکز صرف اس کا شوہر میرزا فخرو رہے۔ وہ خوب سمجھتی ہے لیکن مجبور اور خاموش ہے اور اسی خاموشی کے ساتھ وہ میرزا فخرو کی وفات کے بعد شاہی قلعے سے بھی نکل جاتی ہے۔ تھامس ہارڈی کی ٹیس مجھے بہت پسند ہے۔ انگریزی ادب کا خوبصورت کردار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہارڈی نے بڑے پیار سے اس کردار کو پروان چڑھایا، بنایا، سنوارا اور پھر اپنے ہی ہاتھوں سے تباہ کر دیا۔ وزیر بیگم کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی المیہ پیش آتا ہے کہ وہ جو بڑے اعتماد سے مردوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی عادی ہے، آج پالکی کے بھاری پردوں کے پیچھے چادر میں لپٹی سر جھکائے بیٹھی کو کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ اس لمحے اسے شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی تنہا چھوڑ دیا ہے۔

حواشی

1. Sara Mills: "Discourse", 1997, New York, Routledge, P.17.
2. Michel Foucault: "Power/Truth/Strategy", 1979, Sydney, Feral Publications, P.46.
3. Sara Mills: "Discourse", P.19.

۴۔ گوپی چند نارنگ: ''ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات''، ۱۹۹۴ء، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ص ۱۹۴۔

۵۔ ایڈورڈ سعید: ''مشرق شناسی''، مترجم محمد عباس، ۲۰۰۵ء، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ص ۲۴۷۔

۶۔ احمد محفوظ: ''اُردو کا شاہکار ناول 'کئی چاند تھے سرِ آسماں'' (مضمون) مشمولہ ماہ نامہ اُردو دُنیا، نئی دہلی۔
File://D:\Download\Ilyas\Shamsur Rehman Faruqi

۷۔ شمس الرحمٰن فاروقی: ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' (ناول)، ۲۰۰۶ء، کراچی، شہرزاد، ص ۲۱۔

۸۔ ایضاً، ص ۱۶۳۔

۹۔ ایضاً، ص ۱۶۳-۱۶۴۔

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۶۴۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۷۱۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۲۰۔

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۲۱-۲۲۲۔

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۶۴۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۶۷۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۵۶۱۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۳۸-۳۳۹۔

۱۸۔ ایضاً،ص۴۷۷۔

۱۹۔ انتظار حسین: ڈان، کراچی، ۳۰ جولائی ۲۰۰۶ء۔

۲۰۔ شمس الرحمٰن فاروقی: ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' (ناول)،ص ۶۴۱۔

۲۱۔ ایضاً،ص ۳۰۵۔

۲۲۔ ایضاً،ص ۱۰۷-۱۰۸۔

۲۳۔ سہیل عباس خان: روزنامہ جنگ، ملتان، ۲۱ جولائی ۲۰۰۶ء۔

۲۴۔ شمس الرحمٰن فاروقی: ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' (ناول)،ص ۳۴۲۔

۲۵۔ یاسمین حمید: خبرنامہ شب خون، الہ آباد، نمبر ۲، اکتوبر تا دسمبر، ۲۰۰۶ء،ص ۳۔

Abstract

Michel Foucault and his discourse theory were introduced in Urdu literature when critics were enthusiastically discussing structuralism, post-structuralism and deconstruction. Foucault used the term 'Discourse' in his discussions of power, knowledge and truth and 'power' is a key element in his discussion of discourse. According to Foucault, it is power that decides discourse. Novel "Kayi Chand The Sare Aasman", by Shamsur Rehman Farooqi is one of the best novels in Urdu literature. It portrays the era of Mughal Empire which was declining and sub-continent was gradually becoming a colony of powerful Britain. Hind-European civilization was taking place of Hind-Islamic civilization. Institution of marriage and social relations still existed but its santity was influenced by the keeps. Wazir Begum (Choti Begum) is the heroin of this novel who does not want to marry but desires and prefers to be a keep of any powerful man. She is well aware of her feminine power and enchanting beauty. According to Foucault's discourse theory power has its own

weaknesses, so after the death of Prince Mirza Fakhrou, powerful society forces her to submit before the powerful society and she leaves royal palace quietly.